ہندوستان میں علومِ اسلامیہ کی آمد۔ایک تحقیقی جائزہ

مولانا محمد مجیب الدین قاسمی

تعلیم وتعلّم انسان کا وہ فطری جوہر ہے جس سے قوموں کو سربلندی اور فیروزمندی حاصل ہوتی ہے، اسی سے قومیں عروج وارتقاء کی منزلیں طے کرتی ہیں اور اسی کے نہ ہونے کی صورت میں ذلت وپستی میں جا گرتی ہیں، زمانۂ قدیم سے اب تک ہر قوم کا یہی سرمایۂ افتخار رہا ہے۔ اسلام سے قبل گو اقوامِ عالم میں مذہبی علوم ناپید تھے مگر ان میں علمی ذوق موجود تھا، یہی وجہ تھی کہ مختلف اقوام کی متفرقانہ موشگافیوں سے روم ویونان میں علمِ طب اور حکمت وفلسفہ کا غلغلہ تھا، ہندوستان سے اس وقت کے تعلیم یافتہ ممالک علم ہیئت اور علمِ ریاضی میں زلہ ربائی کرتے تھے، عرب کے بادیہ نشین اور صحرانورد بدوؤں کی فصاحت وبلاغت کا پورے عالم میں طوطی بولتا تھا، مگر جب اسلام آیا تو اس نے لوگوں کے بالخصوص عربوں کے علمی ذوق کو ایک راہ پر لگایا اور انہیں قرآنِ کریم جیسی فصیح وبلیغ کتاب عطا کی جس میں عقائد، توحید وفقہ کے علوم تھے، مگر اس کا عملی نمونہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کی حیاتِ مبارکہ میں تھا، اس لیے آپ کے اقوال وافعال کو محفوظ کیا گیا جس سے بعد میں علمِ حدیث کی رہنمائی کی اور صحابہ کی قرآن فہمی نے علمِ تفسیر کی رہبری کی، غرضیکہ یہی مذہبی علوم اور دینی تعلیمات تھیں جو اسلام کے ساتھ ساتھ پوری دنیا میں پھیل گئیں، لیکن جب تک اسلام کا دائرہ کار عربوں تک محدود رہا، الفاظِ قرآنی پر اعراب ونقطوں کے لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی، اس لیے کہ عرب اہلِ زبان تھے، ان سے کسی اعرابی غلطی کی توقع نہیں تھی، مگر جب اسلام جزیرۃ العرب سے نکلا اور اس کا دائرۂ کار وسیع ہونے لگا اور اہلِ عجم اسلام میں داخل ہونے لگے تو ان عجمیوں سے قرآن پڑھنے میں مختلف قسم کی غلطیاں ہونے لگیں تو اس سے بچنے کے لیے ''صرف ونحو'' کو مدوّن کیا گیا اور ان کے سامنے قرآن کی فصاحت وبلاغت کے معیار کو ''علمِ بیان'' سے آشکارا کیا گیا اور جب فلسفہ کا ٹکراؤ اسلام سے ہوا تو علمِ کلام سے اس کا دفاع کیا گیا، غرض مذہبی علوم میں مختلف علوم وفنون شامل ہوگئے اور اس طرح اس کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور ان علوم کو لے کر جہاں جہاں مسلمانوں کے قدم پہنچے، ان کے ذوقِ علم نے چپہ چپہ پر مدرسوں اور تعلیم گاہوں کا جال بچھا دیا اور اسلامی سلطنت کا کوئی ایسا گوشہ نہ رہا جو علمی سرگرمیوں سے خالی ہو۔

ہندوستان میں دینی تعلیم کا عروج وارتقاء:

ہندوستان میں اسلام کی کرنیں تو عہدِ صحابہ ہی میں پڑنی شروع ہوگئی تھیں اور اسی عہد سے ہندوستان میں عرب تاجروں کی آمدورفت کا سراغ ملتا ہے، مگر دوصدی تک اس ملک میں دینی تعلیم کا نظم کیا رہا؟ تاریخ کے صفحات اس سے خاموش ہیں، ہاں تیسری صدی میں جنوبی ہند کے اندر بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں عربوں نے نومسلم افراد کی تعلیم پر توجہ دی اور مالابار کے ساحلی علاقہ میں کئی مساجد تعمیر کیں جن میں نومسلموں کو مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ (علمِ حدیث میں برِعظیم پاک وہند کا حصہ:۱۰۹) مگر یہ انفرادی کوششیں تھیں جن کی کوئی خاص حیثیت نہیں تھیں۔

غوری نے جب یہاں حملہ کرکے باقاعدہ اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی تو اس کے بعد مسلم حکمرانوں کی علم پروری اور ہنر پروری کی وجہ سے علماء وصوفیاء کے قدم اس ملک میں جم گئے اور ہندوستان جیسے کفرستان میں اسلام کی محبت کا بیج بوکر اور شجرِ اسلام کی آبیاری کرکے دینی تعلیم کو فروغ دیا، جن کی مساعیٔ جمیلہ کا درخت برگ وبار لایا اور تعلیم وتعلّم کا وہ رواج ہوگیا کہ لوگ دینی علوم کے لیے ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ واضلاع کا بکثرت سفر کرتے تھے اور متعدد اہلِ علم کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے، خود علماء میں تعلیم وتدریس، ارشاد وتذکیر، تصنیف وتالیف کا یہ ذوق تھا کہ وہ اپنا وطن کو چھوڑ کر امراء وسلاطین کے دربار کا رخ کرتے تھے جن کی قدردانی اور سرپرستی کی وجہ سے وہ بڑی فارغ البالی سے اپنے مقصد میں مشغول رہتے تھے، اس کے علاوہ خود استاذ طالب علموں کے قیام وطعام کے کفیل ہوتے تھے اور یہ محض خالصتاً لوجہ اللہ ہوتا تھا اسی پدرانہ شفقت ومحبت کی میمونیت کے

جذبات میں اپنے استاد کی جدائیگی ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی تھی، ایسے صاحبِ دل اور عالی حوصلہ استاذ ہوتے تھے جو شاگرد کے مرگِ مفاجات کے سوگ میں بالآخر اس سے جا ملتے تھے۔

درس وتدریس اور حصولِ علم کا یہی اعلیٰ جذبہ موجزن تھا کہ علاء الدین خلجی کے دورِ حکومت میں نصف صدی سے کچھ زائد مدت میں اتنے صاحبِ کمال علماء پیدا ہو گئے کہ اس وقت کے اسلامی علوم کے مراکز، سمرقند وغیرہ میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ (ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر: ۱۵)

درحقیقت ہندوستان اپنی علم پروری اور علمی ماحول کی وجہ سے علمائے اسلام کا آخری ملجاء اور مرجع بن گیا تھا، بیرون ممالک سے بکثرت علماء یہاں آنے لگے تھے، مشہور مؤرّخ ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں غیر ہندی علماء کی ایک طویل فہرست دی ہے جو عالمِ اسلام پر فتنۂ تاتاری کے مہیب تسلط کے بعد سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں ہندوستان میں پناہ گزیں ہوئے، جنہوں نے یہاں درس وتدریس کا حلقہ قائم کر کے دینی تعلیم کو فروغ دیا، جن میں ''مولانا رفیع الدین الشیرازی اور مولانا جلال الدین دوانی'' علیہما الرحمہ قابلِ ذکر ہیں۔ (نظام تعلیم وتربیت ۱/ ۱۴۹) جن کے حلقۂ درس کے فیض سے آج ہندوستانی زندگی معمور ہے۔ آج درسِ نظامیہ پورے ہندوستان کی علمی تشنگی کو سیراب کر رہا ہے مگر شاید ہمارے لیے یہ بات قابلِ تعجب ہو کہ اس کے بانی کا نسب بیرونی ملک سے ملتا ہے اور واقعہ یہی ہے کہ کسی زمانے میں خانوادہ ''ابوایوب انصاری'' کے ایک بزرگ علاء الدین انصاریؒ نے اپنے قدومِ میمنت لزوم سے ہندوستان کو شرف بخشا جن کی نسل میں ملا قطب الدین پیدا ہوئے جنہوں نے دراصل علم وعمل کی رونمائی کے لیے درسِ نظامی کی بنیاد رکھی۔ (مقالات شبلی ۳/ ۱۰۵) جن کے حلقۂ درس سے نابغۂ روزگار علماء اور مایۂ ناز فضلاء پیدا ہوئے اور جن کے سلسلۂ تلامذہ میں کچھ ایسی یگانہ شخصیتیں پیدا ہوئیں کہ اگر عہدِ عالمگیری میں ہندوستان کا اسے طرۂ امتیاز اور سرمایۂ ناز قرار دیا جائے تو وہ اس کا بجا طور پر حق دار ہے جن میں آپ کے بلند اقبال صاحبزادے ''ملا نظام الدین فرنگی محلی'' جو بانی درسِ نظامی سے مشہور ہیں، آپ کے اساتذہ میں مولوی امان اللہ بنارسی، ملا محبّ اللہ بہاری، (صاحبِ سلم ومسلم) قطب الدین شمس آبادی اور ملا جیون (صاحبِ نور الانوار) سرفہرست نظر آتے ہیں۔

اس کثرت سے علم کی نشو ونما اور برق رفتاری سے علماء کی پرورش سے پتہ چلتا ہے کہ عہدِ سلف میں دینی تعلیم کی اشاعت وترویج کے لیے عالمی پیمانہ پر خاص اہتمام اور اس پر غیر معمولی توجہ دی گئی ہوگی، چنانچہ اس بات کی تائید صاحب صبح الأعشی کی اس عبارت سے ہوتی ہے جو دہلی کے بابت رقمطراز ہیں :''صرف دہلی میں عہد تغلق میں ایک ہزار مدارس تھے جن میں ایک شافعی المسلک اور بقیہ سارے حنفی المذہب کے تھے''۔ (صبح الأعشی: ۵/ ۶۹) اس عہد کے متعلق آتا ہے کہ صرف ''ٹھٹھ'' کے اندر مختلف علوم وفنون کے چار سو مدرسے تھے، جن پر شاہی خزانے کا ایک وافر حصہ صرف ہوتا تھا، درحقیقت علماء وصوفیاء کے ذہن ودماغ کی تربیت اور ان کے ذوق ومذاق ہی دینی علوم کے لیے یونیورسٹی کی حیثیت رکھتی تھی کہ جس جگہ کا وہ رخ کرتے تشنگان علوم کے لیے آبِ حیات کا دریا پھوٹ پڑتا اور وہ علم وفن کا معدن ومدفن بن جاتا جس سے ایک خلق کثیر مستفید ہوتی، خود علماء کے گھر اور صوفیاء کی خانقاہیں الگ الگ دار العلوم ہوتے تھے، دار السلطنت دہلی کے علاوہ ایسی دو جگہیں تھیں جو دینی علوم کا مرکز رہی ہیں اور جہاں علماء اور اصحابِ کمال وفن کی وجہ سے علمی سرگرمیاں عروج پر رہی ہیں، ایک شیراز ہند ویا رپورب، جس کے متعلق یہ کہنا بجا ہے کہ اگر دہلی ملک کا دار السلطنت تھا تو وہ علم حدیث کا دار السلطنت تھا، جہاں علم حدیث کی تحقیقات ہوتی تھیں اور پورا ملک اس کی خوشہ چینی کرتا تھا، اسی پر فخر کرتے ہوئے ایک فرماں روا نے کہا تھا ''پورب شیراز مملکت ماست'' کہ پورب ہماری سلطنت کا خلاصہ اور لب لباب ہے۔

یہاں کی علمی سرگرمیوں کا اندازہ مولانا گیلانی کی اس تحقیق سے ہوتا ہے جس کو انہوں نے مآثر الکرام کے حوالے سے بایں الفاظ لکھا ہے: پانچ سے لے کر دس کردہ (مغل عہد میں میل اور کوس کے سوا کروہ سے بھی مسافت کا اندازہ کیا جاتا تھا موجودہ زمانہ میں دو میل ہی کے قریب قریب اسے سمجھنا چاہیے) تک شرفاء کی آبادی ہے جن کو سلاطین وحکام کی طرف سے وظیفہ اور زمین وجائیداد حاصل ہے اور مساجد، مدارس اور خانقاہیں ہی ہوئی

ہیں اور ہر جگہ مایہ ناز مدرسین نے مسند علم وفن بچھا رکھی ہے اور ''اطلبوا العلم'' (طلب علم) کی صدا دے رکھی ہے۔'' (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت ۳۴/۲۱) ویسے تو پورا دیار پورب علم وفن کا گہوارہ بنا رہا مگر ''جونپور'' اپنے علمی سرمایہ کی وجہ سے خاص اہمیت کا حامل رہا ہے جہاں سے علم حدیث کے غلغلے نے پورے ہندوستان کو پُرشور کر دیا، اسی سرزمین سے ہندوستان کے اول شارح بخاری صاحب فیض الباری محدث عبدالاول پیدا ہوئے او راسی خاک سے دیوان عبدالرشید اور ملامحمود فاروقی جیسے اساطین امت اٹھے جن کی بابت علامہ شبلی کا بیان ہے کہ علامہ تفتازانی اور علامہ جرجانی کے بعد ایسے دو نامور اور یگانہ عالم بیک وقت جمع نہیں ہوئے۔ (ہندستان کے سلاطین علماء ومشائخ کے تعلقات پر ایک نظر: ۱۷)

دوسرا ''فرنگی محل'' جو درس نظامیہ کا اولین مرکز ہے، جہاں علماء وفضلاء کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا بقول علامہ شبلی کہ پورے ہندوستان میں جو کوئی دینی علوم کا احرام باندھتا اس کا رخ فرنگی محل کی طرف ہوتا تھا، جس کے زندہ جاوید اور نامور سپوت ''ملا عبدالعلی ملقب بہ بحرالعلوم اور مولانا عبدالحئ لکھنوی'' ہیں ،جن کی علمی خدمات پر ہمارا یہ ملک فخر کرتا ہے اور اسلامی دنیا خراج عقیدت پیش کرتی ہے۔ (مقالاتِ شبلی: ۹۹/۳) ہندوستان کے علمی ارتقاء میں جہاں معلم ومتعلم کے بے غایت جذبہ کو دخل ہے وہیں سلاطین کی حمیت اور شاہانہ سرپرستی کے علاوہ ان کی علمی دلچسپی بھی قابل تعریف ولائق ستائش ہے، جن کی فیاضانہ سرپرستی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی خطیر رقم صرف کر کے بیرونی علماء کو دعوت دیتے تھے جن سے ان کی شاہانہ مجلس اور دربار کی تزئین وتعمیر ہوتی تھی او رجن کے بدولت ان کی حکومت معروف ومشہور ہوتی تھی، شمس الدین التمش کے بارے میں آتا ہے کہ وہ راتوں کو گدڑی میں ملبوس ہو کر علماء کی خبر گیری کرتا رہتا اور خفیہ طریقہ سے ان کے قدموں میں روپیہ ڈال دیتا تھا، وہ خواجہ بختیار کاکیؒ کا مرید تھا، ایک مطلق العنان بادشاہ ہونے کے باوجود ان کی خدمت کیا کرتا تھا (القرءۃ الراشدہ ۱۲/۳) موصوف کے دل میں اہل علم کی قدر ومنزلت کی ترجمانی ان کے الفاظ سے ہوتی ہے جو ضیاء الدین برنی کے توسط سے ہمارے سامنے ہیں: ''میں خداوند تعالیٰ کا اس واقعہ پر کتنا شکر ادا کروں کہ اس قسم کے مددگاروں اور پشت پناہوں سے اس نے میری یاوری فرمائی، جن میں ہر ایک مجھ سے کہیں بہتر ہے، پھر لوگ بادشاہوں کے عام رواج کے مطابق میرے آگے پیچھے چلتے ہیں اور نذر وغیرہ کے لیے میرے سامنے ہاتھ بڑھاتے ہیں اور دربار میں میرے سامنے کھڑے ہوتے ہیں، مگر ان لوگوں کی بزرگی اور سرداری کو دیکھ کر مجھے شرم آتی ہے اور چاہتا ہوں کہ تخت سے اتر کر ان کے ہاتھ اور پاؤں کے بوسہ دوں۔'' (ترجمہ مولانا گیلانی نظام تعلیم وتربیت ۱۴۹/۱)

بلبن کو علماء سے اس درجہ محبت والفت تھی کہ علماء کے بغیر اس کا دسترخوان ناقص رہتا تھا علم پروری کا یہ جذبہ تھا کہ سلاطین اپنے اپنے ذوق ومذاق کے مطابق بیرونی نایاب کتابوں کا ذخیرہ جمع کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد سلف میں نایاب سمجھی جانے والی کتابیں کثرت سے نایاب نہیں رہ گئیں تھیں، آج بمشکل اس کا نمونہ مل سکتا ہے، غرضیکہ علم دوستی اور طلباء پروری سب سے بڑی فیاضی تھی، حکمراں اپنے اپنے دور کی یادگار کے لیے مدارس ومکاتب او رخانقاہوں کی تعمیر کرتے تھے اور کسی کے فخر ومباہات کا معیار یہ ہوتا تھا کہ اس کے عہد میں کیا کیا علمی موشگافیاں ہوئیں ہیں۔ ویسے تو مسلمان امراء میں سے ہر صاحب اقتدار کا زمانہ بلکہ تاریخ ہند کا ہر قرن وعصر اس باب میں عہد زریں ہونے کا حق دار ہے جس میں تعلیمی میدان کا کوئی نہ کوئی نمایاں کارنامہ وجود پذیر ہوا ہے تاہم ان میں بعض ایسے ہیں جو اس میدان میں خاص خصوصیت کے حامل رہے ہیں اگر انہیں علیحدہ علیحدہ احیاء تعلیم کا دور کہا جائے تو یہ حق بجانب ہے، جن کا مختصر سا تذکرہ آئندہ سطور میں درج ہے۔

پہلا دور: تاریخ ہند میں چار ایسے دور گذرے ہیں جن میں تعلیمی سرگرمیاں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی جن میں نئی نئی تحقیقات وجود پذیر ہوئیں اس دور کا آغاز دہلی کے دارالسلطنت سے ہوتا ہے، جس میں علم وفن کو شمس الدین التمش محمد تغلق اور سکندر لودھی جیسے علم پرور اور علم دوست سلاطین کی سرپرستی حاصل رہی ہے یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ہندوستان علم وفن میں اسلامی ممالک کا قائد رہا ہے۔ بے شمار اہل علم وقلم نے چنگیز خان اور ہلاکو کے ہاتھوں ملت اسلامیہ کی تباہی وبربادی کے بعد اپنا ملجاء ہندوستان کو بنایا جن کی وجہ سے علم کا خلاصہ یہاں جمع ہو گیا۔ اس دور میں تعلیم اس قدر عام تھی کہ عورتیں ،کنزیں تک حافظہ ہوتی تھیں، ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق جنوبی ہند کے صرف ایک مقام ''ہنور'' میں تعلیم کو اس قدر فروغ تھا کہ یہاں کی عورتیں

بکثرت حافظ تھیں اور لڑکیوں کے تیرہ اور لڑکوں کے تئیس مدرسے تھے (سفرنامہ ابن بطوطہ/۲۰۷) خود محمد تغلق بہت بڑا عالم اور حافظ ہدایہ تھا (تاریخ دارالعلوم ۱/۲۷) اسی عہد میں جونپور'' کی تعمیر ہوئی جو اپنے وقت کا دارالعلوم اور علماء کے لیے تیموری کشت وخون کے بعد آخری ملجاء تھا چوں کہ اس دور کے سلاطین علم دوست تھے اس لیے ان کی حمایت میں دینی خدمات کو عروج ہوا، فقہ کی تدوین اور تفسیر وتراجم پر خصوصی توجہ دی گئی جس کے شاہی ایماء پر ''فتویٰ تاتارخانی'' معرض تحریر میں آئیں جو اس عہد کا سب سے اہم اور گراں قدر سرمایہ ہے، اس دور میں علماء کا خاص موضوع فقہ رہا ہے، اس لیے کہ کہا جاتا ہے کہ اوئل ساتویں صدی میں ایک گونہ علم وحدیث سے بے اعتنائی پیدا ہوگئی تھی۔

دسرا دور : یہ عہدِ اکبری ہے جسے لوگ گو مذہبی کشمکش کا زمانہ کہتے ہیں بلکہ مذہب کا جنازہ نکل گیا تھا ایک مقالہ نگار کے بقول ''محل کے اندر مندر بھی تعمیر ہوئے ہنومان جی کے بت رکھے گئے'' (ہندوستان کے سلاطین علماء وشائخ کے تعلقات پر ایک نظر/۴۷) مگر اس کا اثر شاہی دربار تک محدود رہا او رحسب مطابق تعلیمی عروج میں کوئی انقلاب نہیں آیا بلکہ اشاعت اسلام میں یہ زمانہ ممتاز رہا (رودکوثر/۱۶۱) اور درس وتدریس میں نمایاں تبدیلیاں اور غیر معمولی اضافہ ہوا، چنانچہ اس کے بابت ایک مؤرخ لکھتا ہے:

> ''اکبر کے زمانہ میں درس وتدریس میں کئی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں، خلجی اور تغلق خانوادوں کے زمانے میں علوم وفنون کی کتابیں ہندوستان میں کم تھیں اور فقہ واصول فقہ کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی، لودھیوں کے زمانے میں معقولات کی چند کتابیں بڑھیں لیکن اکبر کے عہد میں معقولات میں بہت اضافہ ہوا اس کی ایک وجہ ایران اور سمرقند سے بعض علماء کی آمد تھی جنہوں نے منطق اور فلسفے کو رواج دیا۔'' (رودکوثر/۱۶۲)

اس سے معلوم ہوا کہ اکبری دور میں مذہبی کشمکش کے باوجود علوم میں غیر معمولی ترویج وتوسیع ہوئی جس کا سہرا ''مجدد الف ثانی (شیخ احمد سرہندی) او رشیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے سر رکھا جاسکتا ہے جن کے چشمہ فیض سے پورا ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلام بھی سیراب ہورہا تھا۔

تیسرا دور : دینی علوم کے فروغ میں عہد عالمگیری مستقل عنوان کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ آج جو تعلیمی سرگرمیاں ہیں اسی عہد کی رہین منت ہیں یہ وہ دور رہے جس میں بیشتر دیہات وقصبات میں مدارس کا نظم بکثرت تھا اور ان پر شاہی طرف سے اساتذہ مامور تھے۔ (تاریخ دارالعلوم: ۱/۷۸)

فرنگی محل کو انہیں کے بدولت عروج حاصل ہوا درس نظامی گو عہد عالمگیر کے بعد معرض وجود میں آیا مگر اس کی داغ بیل اور اس کے بانی کی پرداخت وپرورش اسی دور میں ہوئی خود عالمگیر جہاں ایک دوراندیش اور غیر معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے حکمراں ومدبر تھے وہیں ایک رمز شناس عالم اور علم دوست شخصیت کے بھی مالک تھے، چنانچہ اپنے دور میں اور خود اپنی نگرانی میں ''فتاوی عالمگیری'' جیسی غیر معولی اہمیت کی حامل کتاب تیار کروائی جس کے متعلق ایک مقالہ نگار کا بیان ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب نے علماء وفضلاء کو فقہ کی تمام کتابوں سے بے نیاز کردیا۔ (رودکوثر: ۴۷۷) الغرض یہ دونوں عہد (اکبری وعالمگیری) تاریخ ہند کا روشن باب ہیں اور اس عہد کی تعلیمی سرگرمیاں خود ایک مستقل موضوع کی متقاضی ہیں ان دونوں فرماں رواؤں کا عہد دسویں صدی سے بارہویں صدی کا زمانہ ہے، یہ وہ زمانہ تھا جس میں عالم اسلام کی قیادت ترکوں کے ہاتھ میں تھی مگر وہ علمی میدان میں اپاہج ومفلوج ثابت ہونے لگے بلکہ پورا عالم اسلام جمود وتعطل کا شکار تھا عالمی پیمانے پر علمی انحطاط اور مذہبی تنزلی تھی، اس کے برخلاف یورپین قومیں بڑی تیزی سے عروج وترقی کے مدارج طے کررہی تھیں چنانچہ مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کے الفاظ اس جانب مشیر ہیں:

> ''علمی جمود اور ذہنی اضمحلال اس وقت صرف ترکی اور اس کے علمی اور دینی حلقوں کی خصوصیت نہیں تھی واقعہ یہ ہے کہ پورا عالم اسلامی مشرق سے مغرب تک ایک علمی انحطاط کا شکار ہوچکا تھا، دماغ تکھے تکھے تھے اور طبیعتیں بجھی بجھی سی نظر آتی تھیں اور ایک عالمگیر جمود وافسردگی چھائی ہوئی تھی۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر ۱۸۷)

جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس طویل عرصہ میں خال خال ایسے افراد ہوئے جو علمی میدان کے شہسوار نکلے جنہوں نے علمی خزانے میں کوئی گراں مایہ اضافہ کیا

ہوگر یہ فخر صرف ہندستان ہی کو حاصل ہے جس نے اس علمی قحط سالی میں بھی جبال علم کو پیدا کیا جو ہندوستان کے لیے دیگر ممالک اسلامیہ سے وجہ مابہ الامتیاز بن جاتی ہے، حضرت مولانا ابوالحسن علی میاںؒ ہندوستان کے اس طرہ امتیاز اور گراں قدر علمی خدمات کو ان الفاظ میں یاد کرتے ہیں:

''پچھلی صدیوں میں ہم صرف چند افراد کا استثناء کرتے ہیں، جو اپنے زمانہ کی عام علمی وذہنی سطح سے بہت بلند تھے اور جنھوں نے دینی یا علمی دائرہ میں کوئی بڑا انقلابی کارنامہ یا علمی شاہکار پیش کیا ہو، خوش قسمتی سے ان تمام مستثنیٰ افراد کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے ہے ان میں سے ایک حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ہیں جن کے مکتوبات اسلام کے علمی ودینی سرمایہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہیں اور جنھوں نے پورے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا ہے دوسرے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں جن کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ''، ''ازالۃ الخفاء''، ''الفوز الکبیر'' اور ''رسالۃ الانصاف'' اپنے موضوع پر بالکل منفرد تصنیفات ہیں، تیسرے ان کے صاحبزادے شاہ رفع الدین دہلوی ہیں جنھوں نے اپنی تصنیفات ''تکمیل الاذہان اور ''رسالہ اسرار المحبت ''میں بعض نئے خیالات کا اظہار کیا چوتھے شاہ اسماعیل شہید دہلویؒ ہیں جن کی کتاب ''منصب امامت'' اور ''عبقات'' اجتہادی شان رکھتی ہیں اور اپنے اپنے موضوع پر بے نظیر ہیں (حوالہ سابق)

الحاصل ان حضرات نے تعلیمی میدان کی پرورش وپرداخت کی اور ابتدائے سلطنت سے اب تک جتنے علوم نے وقتاً فوقتاً عروج پایا ہر ایک کو دہرادیا او ردینی علوم کے ہر شجر کی آبیاری کی۔ ان حضرات کا زمانہ گو کہ سقوط ہند کا مقدمہ تھا اور ان کے بعد مسلمان سیاست سے محروم ہوگئے مگر اس کا نعم البدل تصنیفات کی شکل میں چھوڑ گئے آج دینی علوم وفنون کی جو کرنیں نظر آرہی ہیں اسی عہد مسعود کا فیض واثر ہے۔

آخری اور پائیدار دور: یہ وہ دور ہے جس میں احیاء تعلیم کی عظیم تحریک وجود میں آئی اور اسلامی تعلیم اور تحفظ ملت کا چشمہ پھوٹا جسے آج ایشیاء کی عظیم مرکزی درسگاہ ہونے کی حیثیت حاصل ہے جس کے قیام کی داعی شاہ ولی اللہؒ کی فکر ہے (از مقدمہ تاریخ دارالعلوم دیوبند) جو منجانب اللہ آپ کے قلب اطہر پر القاء کی گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں آپ نے سمجھ لیا کہ زمانے نے اب کروٹ لی ہے لہٰذا محض دین کے کلیات کو پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں جب تک کہ ان کلیات کو جزئیات میں تبدیل کرکے نقلی وعقلی براہین سے مدلل اور واضح نہ کیا جاوے حتی کہ اسلام عقل کے موافق نظر آنے لگے یہی وہ فکر ہے جس کا حاصل ''حجۃ اللہ البالغہ'' ہے جس کو آپ نے اپنی مذکورہ کتاب کی وجہ تالیف میں ذکر کیا ہے۔

الحاصل یہ فکر آپ سے منتقل ہوتی گئی یہاں تک تا کہ وہ دور آیا کہ ہندوستان سے اسلامی سلطنت کا چراغ گل ہوگیا اور مغربی ثقافت وتعلیم لے کر انگریز برسر اقتدار ہوا جو ایک فاتح کی حیثیت سے ہماری مذہبی تعلیم پر مسلط ہوا، اس لیے کہ فاتح کا اثر نہ صرف مفتوح قوم کے وضع قطع اور چال ڈھال پر پڑتا ہے بلکہ اس کے نظر وفکر اور ثقافت وکلچر پر بھی حملہ آور ہوتا ہے اور یہ تو ایک امر طبعی ہے کیونکہ فاتح صرف عسکری طاقتوں کے زور پر کسی قوم کو محکوم نہیں بنا سکتا بلکہ اس کے لیے علمی اور ثقافتی بالادستی بھی ضروری ہوتی ہے، یہ ایک انتہائی پیچیدہ صورت حال تھی جس سے ہندوستانی مسلمان دوچار تھے اور انہیں اپنے مذہبی ثقافت کی حفاظت بھی کرنی تھی، اس لیے ہندوستان ارباب فکر ولی اللہی اور سرد وگرم چنیدہ علماء نے ہندی مسلمانوں کی ڈگمگاتی ہوی کشتی کو سنبھالا اور ان کی تعلیم کے لیے درس نظامی کے طرز پر از ہر ہند، دارالعلوم دیوبند قائم کیا جس نے مسلمانوں کو جمود وبے حسی کے غار عمیق سے نکالا جو تن تنہا اپنی شاندار خدمات اور شان وشوکت میں عہد تغلق کے ایک ہزار مدارس کی تعلیمی خدمات اور دہلی کے مدرسہ فیروز شاہی کی شان وشوکت کو چیلنج کرسکتا ہے درحقیقت اس الہامی درسگاہ نے قلیل مدت میں وہ خدمات (خواہ از قبیل تعلیم وتربیت ہوں یا از قبیل سیاست ہوں) پیش کیں کے تاریخ ہند بلکہ تاریخ اسلام میں اس کی نظیر بمشکل مل سکے، پھر اس نے اپنی روش وطرز پر بے شمار دارالعلوم کا جال اس وسیع وعریض ملک میں پھیلایا جو اسی وقت سے آج تک تعلیم کا ایک محرک وفعال شعبہ ہیں۔

درس نظامی میں علم حدیث کی اہمیت: ہندوستان میں دینی تعلیم کا ایک بڑا حصہ درس نظامی سے متعلق ہے، جسے بالفاظ دیگر ''تعلیمی مضامین'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اس نصاب میں ان موضوعات کی تعلیم دی جاتی ہے ''صرف، نحو، منطق، حکمت، ریاضی، بلاغت، فقہ، اصول

فقہ، علم کلام، تفسیر، حدیث'' مگران میں سے فقہ، تفسیر اور علم حدیث اصل الاصیل کی حیثیت رکھتے ہیں چوں کہ یہاں زیادہ تر بیرونی علماء سے تعلیمی رواج عام ہوا جو اکثر حنفی المسلک تھے اس لیے فقہ حنفی کو خاص فروغ ہوا اور اسی کا اثر آج بھی ہے مگر اس موضوع سے صرف نظر کرتے ہوئے علم حدیث کی جانب عنان توجہ کی جائے تو یہ بات بے غبار ہو جاتی ہے کہ ہندوستان علم حدیث کی عظیم خدمات کا حامل رہا ہے جس پر پورا عالم اسلام اس کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے اور کرتا رہے گا (انشاء اللہ)

اس بڑے دعوی کی دلیل میں صرف ''حسن الصنعانی لاہوری'' کی عظیم خدمات کو پیش کیا جا سکتا ہے جنہوں نے ایسے پُر خطر دور میں علم حدیث کی طرف توجہ کی جب عالم کی کامل توجہ فقہی مذاہب پر مرکوز تھی، جس کے لیے بڑے پیمانے پر مکاتب و مدارس قائم کیے جا رہے تھے اور آپس میں چشمک کی وجہ سے ہر فقیہ اپنے اپنے مذہب کی برتری اور نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لیے بالآخر ضعیف اور جعلی حدیث کا سہارا ہی لے رہے تھے اور حسبِ منشاء احادیث وضع کی جانے لگی تھیں، یہاں تک کہ ضعیف تو درکنار بلکہ موضوع احادیث کو تلقی بالقبول حاصل ہو رہا تھا، حتی کہ قصہ گو اپنی دلچسپی کے لیے احادیث کو وضع کرتے تھے، غرضیکہ علم حدیث بازیچۂ اطفال بن گیا تھا، ایسے وقت میں وہ عالم اسلام کے سامنے نقاد بن کر آئے اور حدیث کی تحقیق و تنقیح کی اور اپنی تصانیف سے عالم اسلام کو روشناس کرایا جن میں ''مشارق الانوار'' شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ (علم حدیث میں برِاعظم پاک و ہند کا حصہ ۲۵۴ تا ۲۵۹) بلکہ یہ کہنا حق بجانب ہے کہ اگر ہندی محدثین عالم اسلام کے انحطاط کے وقت توجہ مرکوز نہ کرتے تو آج اسلامی ممالک اس کے بارے میں مشقت میں پڑ جاتے اور شاید آج اس علم کا یوں غلغلہ رہتا جیسا کہ علامہ رشیدی رضا مصری کی تحریر سے واضح ہوتا تھا:

''اگر علوم حدیث کے ساتھ ہمارے ہندوستان بھائیوں کے علماء کی توجہ اس زمانہ میں مبذول نہ ہوتی تو اسلام کے مشرقی علاقوں میں اس علم کا خاتمہ ہو جاتا، کیونکہ مصر و شام، عراق، حجاز سب ہی دسویں صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری تک تو ضعفِ درجہ کمال کو پہنچ گیا تھا۔ (از مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ)

پھر جب ہم تاریخ کا غائر مطالعہ کرتے ہیں تو دوسری صدی ہی سے ہندوستان میں علم حدیث کی شمع نظر آتی ہے جسے عربوں نے آ کر سندھ کے علاقہ میں روشن کیا تھا اور چوتھی صدی تک رفتہ رفتہ یہ رمق طالبانِ ہند میں بھی پیدا ہو گئی، جس کے لیے وہ حاز کا رُخ کرتے تھے۔ منصوری محدثین اسی عہد کی یادگار ہیں، مگر چھٹی صدی تک یہ روشنی مدھم سی رہی لیکن اس میں بعض لعل و گوہر نکلے اور چھٹی صدی میں گو یہ ملک اسلامی ہو چکا تھا مگر فقہ اور معقولات نے حدیث کو دبائے رکھا، البتہ ایک دور آیا کہ دکن میں بہمنی اور گجرات میں مظفر شاہی کی تخت نشینی ہوئی جنہوں نے اپنی فیاضانہ سرپرستی میں علم حدیث کی ترویج کے لیے عالم اسلام سے چیدہ چیدہ محدثین کو دعوت دی۔ (علم حدیث میں برِاعظم پاک و ہند کا حصہ ۱۰۷) جنہوں نے یکسوئی کے ساتھ ہندوستان میں اس علم کا احیاء کیا جن کے حلقۂ درس سے متعدد محدثین پیدا ہوئے اور مختلف مکاتبِ فکر کا وجود ہوا، انہیں مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے شاہ ولی اللہ اور شیخ عبدالحق ہیں جن تک حدیث کا سلسلہ اسناد ملتا ہے اور ان ہی اکابرین کی مساعیٔ جمیلہ کی صحیح ترجمانی اور علوم و فنون کی سرپرستی ملت کے دینی مدارس کر رہے ہیں، یہ ادارے نہ صرف یہ کہ باشندگانِ ہند کو علم حدیث کا ریسرچ اور تحقیق پیش کر رہے ہیں بلکہ اس کی تعلیم کے لیے ایک اچھا انتظام کر کے انہیں دیگر ممالک کی محتاجگی سے بے نیاز کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان اداروں کے فیض سے سارے عالم کو بھرپور استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین